آئیں ۔ علاوہ ازیں قاضیوں کے انتخاب و تقرّر کے معاملہ میں بھی دیانت ، امانت ، تقوی ، خدا ترسی اور صلاحیت کار کے بجائے حکام رسی ، چاپلوسی اور خوشامد و رشوت معیار انتخاب بن گئی ۔ یہ صورت حال جب سامنے آئی ۔ تو فقہاء متاخرین نے خالص دینی مصلحت کے پیش نظر اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر یہ فتوی دیا کہ قاضی اپنے ذاتی علم کی بناء پر مقدّمات میں فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہے بلکہ قاضی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنا فیصلہ صرف ان قابل اعتماد گواھوں کی اس پوری شہادت کی بناء پر کرے جو عدالت میں باقاعدہ پیش کی جا چکی ھو حتی کہ عدالت کے دائرہ سے باھر قاضی نے اگر کسی معاھدے ، یا قرض کے معاملے یا کسی اور واقعے کا مشاھدہ خود کیا ھو اور فریقین میں سے کوئی مدّعی بن کر اس کی عدالت میں دعوی دائر کرے ۔ اور فریق ثانی اس مدّعی کے دعوے کا انکار کرے تو اس صورت میں بھی قاضی معتبر شہادت کے بغیر فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھے گا ۔ اب اصل حنفی مسلک کو چھوڑ کر اس فتوی کا سبب یہی ہے کہ قاضیوں کو اگر ان کے ذاتی علم کی بناء پر فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو اس فساد کے زمانہ میں یہ قوی اندیشہ ہے کہ وہ کسی ایک فریق کی پاس داری میں غلط فیصلہ کریں گے اور جس کے حق میں جو وہ چاھیں گے وھی فیصلہ نافذ کر دیں گے اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہ ھو سکیں گے ۔ قاضیوں پر اس پابندی سے اگر چہ دوسری طرف اس بات کا بھی خطرہ موجود ہے کہ ھو سکتا ہے بعض حق داروں کے حقوق شہادت فراھم نہ ھونے کی وجہ سے ان کو نہ مل سکیں گے لیکن دوسری طرف بھی اندیشہ تھا اور بہت سی غلط کاریوں کا سدّ باب اسی طریقے پر ممکن ہے چنانچہ اس امر پر اب تقریباً اتفاق ہے کہ اگر قاضی اپنے ذاتی علم کی بناء پر فیصلہ کرے گا تو اس کا فیصلہ نافذ نہ ھوگا ۔ الدر المختار میں ہے (الکتابة بعلمه کالقضاء بعلمه) فی الاصح بحر فمن جوزه جوزها و من لا فلا الا ان المعتمد عدم حکمه بعلمه فی زمانناا شباه ۔ اس پر علامہ شامیؒ نے لکھا ہے قوله الا ان المعتمد ای عند المتأخرین لفساد قضاة الزمان و عبارة الاشباه الفتوی الیوم

علی عدم العمل بعلم القاضی فی زماننا کما فی جامع الفصولین (شامی ج ۴ صفحہ ۳۶۹) آگے لکھتے ھیں فیجوز القضاء بعلمه وهذا علی قول المتقدمین وهو خلاف المفتی به کما علت (صفحہ ۳۶۹) شامیؒ نے ایک اور جگہ لکھا ہے وھذا مبنی علی ان للقاضی العمل بعلمه والفتوی علی عدمه فی زمانناکمانقلهفی الاشباه عن جامع الفصولین و قید بزماننا لفساد القضاة فیه و اصل المذهب الجواز و سیأتی تمامه فی باب کتاب القاضی الی القاضی (شامی ج ۴ ص ۳۵۹) ۔

(۵) اصل حنفی مسلک جو تمام متون فقہ حنفی میں مذکور ہے یہ ہے کہ کسی غائب مدّعاعلیہ کے خلاف یا اس کے حق میں قاضی فیصلہ نہیں کر سکتا ۔ ولا یقضی علی غائب ولاله ای لا یصح بل ولا ینفذ علی المفتی به بحر الابحضور نائبه ای من یقوم مقام الغائب حقیقة کوکیله و وصیة و متولی الوقف الخ (درّ مختار علی ھامش الشامی ج ۴ ص ۳۳۹) لیکن جہاں مصلحت کا تقاضا ھو اور ضرورت پیش آ جائے اور احیاء حقوق پیش نظر ھو اور کسی مظلوم کی دادرسی کا تقاضا ھو تو فقہاء کرام نے فتوی دیا ہے کہ قضاء علی الغائب بھی جائز و نافذ ہے۔ بعض حضرات نے اس بارے میں اتنی احتیاط ضرور کی ہے کہ شافعی المسلک قاضی ایسا فیصلہ کر دے جو غائب کے خلاف یا اس کے حق میں ھو اور شافعی قاضی کا یہ فیصلہ حنفیوں کے ھاں نافذ اور واجب العمل ھو جائے گا ۔ اور بعض فقہاء نے اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی وہ فرماتے ھیں کہ چونکہ ائمہ ثلاثہ اس کے جواز و نفاذ کے قائل ھیں اور مسئلہ اجتہادی ہے ضرورت و مصلحت کا تقاضا ہے اس لئے حنفی قاضی بھی قضاء علی الغائب کر سکتا ہے اور یہ فیصلہ بالکل جائز اور نافذ ھوگا ۔

چنانچہ علامہ شامیؒ نے الدر المختار کی عبارت ولو قضی علی غائب بلا نائب ینفذ فی اظهر الروایتین عن اصحابنا الخ کی تشریح و توضیح میں بڑی تفصیل کے ساتھ یہ مسئلہ لکھا ہے اسی سلسلہ میں وہ لکھتے ھیں وقال فی جامع الفصولین قد اضطربت آراء هم و بیانهم فی مسائل الحکم للغائب وعلیه ولم یصف و لم ینقل عنهم اصل قوی ظاهر یبنی علیه الفروع بلا اضطراب و اشکال

فالظاهر عندی ان یتأمل فی الوقائع و یحتاط ویلاحظ الحرج و الضرورات فیفتی بحسبها جوازاً او فساداً مثلا لو طلق امرأته عند العدل فغاب عن البلد ولایعرف مکانه او یعرف ولکن یعجز عن احضاره او عن ان تسافر الیه هی او وکیلها لبعده او مانع آخرو کذا المدیون لو غاب وله نقد فی البلـــد او نحو ذلک ففی مثل هذا لوبرهن علی الغائب و غلب علی ظن القاضی انه حق ولا تزویر ولا حیلة فیه فینبغی ان یحکم علیه وله وکذا للمفتی ان یفتی بجوازه دفعا للحرج و الضرورات وصیانة للحقوق عن الضیاع مع انه مجتهد فیه ذهب الیه الائمة الثلاثة و فیه روایتان عن اصحابنا و ینبغی ان ینصب عن الغائب وکیل یعرف انه یراعی جانب الغائب ولا یفرط فی حقه ۱ھ واقره فی نور العین قلت و یؤیده مایأتی قریبا فی المسخر و کذا ما فی الفتح من باب المفقود لا یجوز القضاء علی الغائب الاّ اذارأی القاضی مصلحة فی الحکم له و علیه فحکم فانه ینفذ لانه مجتهد فیه ۱ ھ قلت و ظاهره ولو کان القاضی حنفیا ولو فی زماننا ولا ینافی مامرّ لان تجـــــــویز هذا للمصلحة و الضرورة (شامی ج ۴ ص ۳۵۴)

میں جو کچھ کہنا چاھتا ھوں اس کو مبرّھن کرنے کے لئے اتنی دلیلیں اور مستند کتب فقہ حنفی سے نقل کردہ اتنی مثالیں کافی ھیں اور میں سمجھتا ھوں کہ اس ساری تفصیل سے یہ بات بالکل واضح ھو گئی ہے کہ دینی ضرورت و مصلحت کی بناء پر بعض اجتہادی مسائل پر نئے سرے سے غور کرکے باقی تینوں ائمہ کرام کے اجتہادی فیصلوں کو قبول کرنا خود حضرات حنفیہ کے ھاں بھی معمول رھا ہے اور موجودہ دور میں فقہی مسائل کی تدوین جدید میں اس طریق کار کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کے لئے یہ نہایت ضروری ہے اور اس کا پورا پورا خیال رکھنا پڑے گا کہ یہ کچھ اصول و قواعد کے مطابق ھو۔ اور یہ اجتہاد کرنے والے واقعةً بھی ھر لحاظ سے اس کے اھل ھوں اور یہ اجتہاد بھی شخصی اور انفرادی نہ ھو بلکہ اجتماعی اور شورائی ھو۔ کسی نفسانی خواھش ، مادی رجحان یا کسی ذھنی مرعوبیّت اور مغرب کی نقالی کی بنیاد پر نہ ھو۔ واقعی اجتماعی ضرورت پیش آئی ھو۔ اھل علم اور اھل تقوی

نے صاف دل کے ساتھ اس ضرورت کا احساس کیا ہو ۔ ایسے واقعی محرکات موجود ہوں جو اس قسم کے اجتہاد کے داعی ہوں لهذا اس سلسلہ میں اجمالاً اجتہاد اور مجتہد کے بارے میں بھی چند باتیں عرض کرنا ضروری ہے۔

اجتہاد کی تعریف علماء اصول فقہ نے یوں کی ہے ۔ بذل الجهد فی استخراج الاحکام من شواهدها الدالّة علیها بالنظر المؤدی الیها ۔ یا بعض نے لکھا ہے استفراغ الفقیه الوسع لتحصیل ظنّ بحکم شرعی ۔ اجتہاد کے لغوی معنی کسی امر کی تحقیق میں اپنی امکانی کوشش صرف کرنا ہے ۔ اور فقہاء کرام کی اصطلاح میں اس امکانی کوشش صرف کرنے کو اجتہاد کہتے ہیں جو دلائل شرعیہ کے ذریعے استنباط احکام و مسائل میں صرف کی جائے ۔ بعض فقہاء کرام نے اس کے ساتھ یہ قید بھی بڑھا دی ہے کہ اس بارے میں اتنی زوردار کوشش اور جدو جہد ہو کہ وہ یہ محسوس کرے کہ اب اس سے زیادہ اور کوشش نہیں کی جا سکتی ۔ نیز بعض فقہاء نے غلبۂ ظن کی قید بھی لگائی ہے ۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ پیش آمدہ مسئلہ کو شریعت کے منشا کے مطابق کرنے یا کسی حکم شرعی کے تحت لانے میں اتنی کوشش کی جائے کہ یہ گمان غالب حاصل ہو جائے کہ شریعت کا یہی مقصد و منشا ہے ۔ اس قید کے لگانے کا ایک خاص فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے کتاب و سنت سے صریحاً ثابت شدہ احکام ، اور اجتہادی مسائل میں فرق ہو جائے گا ۔ کیونکہ پہلی قسم کے احکام میں قطعیت ہوتی ہے اور دوسری قسم کے احکام میں غلبۂ ظن ہوتا ہے ۔ یہ اس تقریر کا اردو میں خلاصہ ہے جو علامہ عبد العزیز بخاریؒ نے ,,کشف الاسرار شرح اصول فخر الاسلام بزدویؒ،، میں کی ہے ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے شرح بزدویؒ ج ۴ ص ۱۱۳۴)

امام فخر الاسلام بزدویؒ فقہ اور اصول فقہ کے مسلّم اور جیّد حنفی امام ہیں ۔ انہوں نے مجتہد کے بارے میں یوں لکھا ہے ۔ هو ان یحوی علم الکتاب بمعانیه و وجوهه التی قلنا و علم السنة بطرقها و متونها و وجوه معانیها و ان یعرف وجوه القیاس علی ما تضمنه کتابنا هذا (اصول فخر الاسلام بزدویؒ برهامش کشف

الاسرار جلد ۴ ص ۱۱۳۵)

حضرت امام شافعیؒ نے کتاب الام میں تحریر فرمایا ہے۔ و لیس للحاکم ان یقبل ولا للوالی ان یدع احدا ولاینبغی للمفتی ان یفتی احد الامتی یجمع ان یکون عالما علم الکتاب وعلم ناسخه منسوخه و خاصه وعامه و ادبه و عالما لبسنن رسول الله ﷺ و اقاویل اهل العلم قد یما و حدیثا و عالما بلسان العرب عاقلا یمیز بین المشتبه و یعقل القیاس فان عدم واحداً من هذه الخصال لم یحل له ان یقول قیاساً (کتاب الام جلد ۷ ص ۲۷۴)

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالیؒ نے مستصفی الاصول میں مجتهد کے لئے دو لازمی شرطیں لکھی هیں ۔

احدهما ان یکون محیطاً بمدارک الشرع متمکنا من استثمار الظن بالنظر فیها و تقدیم ما یجب تقدیمه و تاخیر ما یجب تاخیره و الثانی ان یکون عدلا مجتنباً عن المعاصی القادحة فی العدالة (مستصفی الاصول ج ۲ ص ۱۰۱)

اسی طرح امام شاطبیؒ نے بھی مجتهد کے لئے دو شرطوں کا ذکر کیا ہے :

احدهما فهم مقاصد الشرع علی کما لها و الثانی التمکن من الاستنباط بناءً علی فهمه فیها اور پھر اس تمکن فی الاستنباط کی تشریح یوں فرمائی ہے هو بواسطة معارف محتاج الیها فی فهم الشریعة ۔ اس کا مطلب یہ هوا کہ اجتهاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مجتهد مقاصد شریعت کو خوب اچھی طرح جانتا هو اور اس مسئلہ کے بارے میں ان علوم و معارف سے واقف هو۔ جو اس کو پیش آمدہ صورت کا حکم مستنبط کرنے کے قابل بنا سکیں ۔ یعنی وہ اس مسئلہ کے بارے میں قرآن مجید کی تمام متعلقہ آیات پر ، رسول اللہ ﷺ سے منقول و مروی تمام احادیث صحیحہ پر ، اقوال صحابۂ کرام اور اجماع صحابہ پر ، پوری طرح نظر رکھتا هو ۔ اور اسی کے ساتھ قیاس کے شرعی طریقہ اور اس کے اصول و ضوابط سے بھی خوب اچھی واقفیت رکھتا هو ۔ اور پھر اسی کے ساتھ شریعت اسلامیہ کی پوری روح اور اس کے احکام کے مقاصد پر بھی اس کی نظر هو۔ اور جس شعبۂ زندگی سے اس مسئلے کا تعلق ہے اس کے بارے میں

بھی اس نے پورا علم حاصل کیا ہو ۔ یہ جانتا ہو کہ اس مسئلہ کے بارے میں اس دور کے اہل زمان کے ہاں عرف عام کیا ہے اور عرف خاص کیا ہے۔ اگر کسی شخص میں مندرجہ بالا اوصاف پائے نہیں جاتے اس نے اجتہاد کیا اور کوئی شرعی مسئلہ بتلایا ۔ تو جب اس میں مندرجہ بالا شرائط قبول کو نظر انداز کر دیا گیا ہے تو پھر یہ اجتہاد قابل قبول ہر گز نہیں اور یہ شرعی مسئلہ بالکل نہیں ہوگا ۔ مجتہد میں مندرجہ بالا اوصاف ضرور ہوں اس مسئلہ میں تمام فقہاء کرام ہر مسلک و ہر مشرب کے بالکل متفق الرائے ہیں۔

اصول فقہ کی جتنی بھی کتابیں ہیں اور جس فقہی مسلک کے مستند اور مسلّم عالم نے لکھی ہیں ان سب میں الفاظ و تعبیرات کے معمولی اختلاف کے ساتھ انہی شروط کا ذکر موجود ہے۔ نیز مجتہد کے لئے صرف کتاب و سنت کے علم و فہم کی ضرورت نہیں بلکہ کتاب و سنت کی روشنی میں علماء کرام نے اس کے لئے ایک مخصوص سیرت و کردار اور عملی زندگی میں تقوی و طہارتؒ کی شرط بھی لگائی ہے جیسا کہ امام غزالیؒ کا قول ذکر ہو چکا ۔ یعنی وہ متقی ہو ، عادل ہو ، کبائر سے مجتنب ہو ۔ فرائض و واجبات کا پورا پورا پابند ہو۔ جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے من عمل بما علم ورثہ اللہ علم ما لم یعلم شریعت کے احکام پر عمل کرنے سے اللہ تعالی شرح صدر کرتا اور ذہن کو کھولتا اور روشن کرتا ہے اور جو اس سے پہلے علم میں نہ ہو وہ اس کے علم میں لے آتا ہے۔ اور عقل سلیم بھی یہ گواہی دیتی ہے کہ جس شخص کا کتاب و سنت کی تعلیمات پر عمل نہ ہو اس پر کب نئے نئے شرعی علوم کا انکشاف ہو سکے گا ۔

اسلامی قوانین کے چار مآخذ ہیں (۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ ﷺ ما لا یدرک بالقیاس اقوال صحابۂ کرام بھی حکماً اس میں داخل ہیں (۳) اجماع صحابہ اور اجماع مجتہدین (۴) اجتہاد جو قیاس یا استحسان یا مصالح مرسلہ یا عرف کی بنا پر کیا جائے ۔ ما یدرک بالقیاس وہ اقوال و افعال حضرات صحابۂ کرام جن کا مرفوع ہونا ثابت نہ ہوا ہو وہ بھی اسی میں شامل

هیں ۔ اس وقت زیر بحث یہ آخری مأخذ ہے ۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی وفات کے سانحہ کے بعد خلفائے راشدین کے دور سعادت میں اجتہاد پر شورائی رنگ غالب تھا ۔ خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق رضي الله تعالى عنه اور ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی الله تعالى عنه اهم پیش آمده مسائل میں چاہے وہ حقوق اللہ سے متعلق ہوتے یا حقوق العباد سے یا چاہے ملکی سیاست اور نظام حکومت سے ، اهل شوری (اکابر صحابۂ کرام) کو ایک جگہ جمع فرماتے اور مسئلہ سامنے لے آتے اور ان سب حضرات کے صلاح و مشورہ سے پیش آنے والے مسئلہ کا شرعی حل تلاش فرماتے ۔ اسی سلسلہ میں ان کا یہ طرز عمل اس نصّ قرآنی کے عین مطابق تھا جو انہیں بلاتخصیص ہر معاملہ میں مشورہ کرنے کی ہدایت کرتی تھی وامرھم شوری بینھم » اس کے ساتھ ھی ساتھ وہ رسول اللہ ﷺ کے ایک دوسرے ارشاد سے بھی مطابقت رکھتا تھا جو آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی الله تعالى عنه کو مخاطب کرکے فرمایا تھا ۔ روایات میں ہے کہ ایک موقع پر حضرت علی رضی الله تعالى عنه نے جناب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر کسی مسئلہ میں مسلمانوں کو کتاب و سنت میں کوئی نص نہ ملے جس سے وہ رہنمائی حاصل کرکے عمل کر سکیں تو پھر وہ کیا کریں اس معاملہ میں شرعی حکم کیسے معلوم ہوگا ۔ تو آپ نے ارشادفرمایا شاوروا فیه‌الفقهاء العابدین ولا تمضوا فيه رآی خاصة (رواه الطبراني فی الاوسط ورجاله موثقون من اهل الصحيح (مجمع الزوائد للحافظ نور الدين الهيثمي المتوفى ۸۰۷ ج ۱ ص ۱۷۸) یعنی اس معاملہ میں فقہاء عابدین (یعنی ماہرین شریعت راسخ العلم علماء اور عبادت گذار و دیانت دار لوگوں) سے مشورہ حاصل کرو اور انفرادی رائے کو اختیار نہ کرو ۔ ایک دوسری روایت میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی الله تعالى عنه کے سوال کے جواب میں بھی آپ نے فرمایا تھا تجعلونه شوری بين العابدين من المؤمنين ولا تقضونه برأی خاصة (یعنی اس قسم کا غیر منصوص معاملہ عبادت گذار اور دیانتدار مؤمنین کی شوری کے حوالے کرو تاکہ آپس کے مشورہ کے بعد اجتماعی فیصلہ حاصل ہو جائے انفرادی رائے پر کوئی فیصلہ

مت کرو۔)(مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۷۸) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ کا عام معمول یہ نقل کیا گیا ہے کہ کسی مسئلہ شرعیہ کے بارے میں اگر ان کو تلاش و جستجو کے باوجود قرآن مجید یا سنت رسول اللہ ﷺ سے شرعی حکم معلوم نہ ہوتاتوصرف اپنا اجتہاد کرکے کوئی فیصلہ نہ فرماتے بلکہ جمع رؤس الناس و خیارهم فاستشارهم فاذا اجتمع رأیهم علی امر قضی به (سنن الدارمی ج ۱ ص ۵۸ باب الفتیا ومافیه من الشدّة) یعنی وہ لوگوں کے سردار اور قوم میں ممتاز اور ان میں سب سے بہترین لوگ جمع کرتے ان سے مشورہ طلب کرتے بحث ور گفتگو ہوتی اور آخر کار جب کسی بات پر سب کی رائے جمع ہو جاتی تھی تو آپ اس مسئلہ کے بارے میں متفقہ رائے کے مطابق فیصلہ فرما دیتے تھے۔ اور کنز العمال میں اس کے ساتھ یہ روایت بھی ہے و کذلک یفعل عمرؓ (یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کا طریق کار بھی اس بارے میں یہی تھا (برحاشیۂ مسند احمد ج ۲ ص ۱٦٦) صحاح ستہ میں بہت سی روائتیں موجود ھیں کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ کے ھاں باقاعدہ اہل شوری کا اجتماع ہوتا۔ اور پوری بحث و تمحیص کے بعد کوئی متفقہ بات طے ہو جاتی اور وہ اسی کو نافذ فرماتے پھر جب خلافت راشدہ کا یہ دور سعادت و برکات گزر گیا۔ نظام خلافت میں اختلال راقع ہوا۔ خلافت علی منہاج النبوۃ باقی نہیں رہی۔ اس لئے حکمرانوں کی طرف سے شرعی مسائل کی تحقیق کے لئے شورائی نظام قائم کرکے مسائل طے کرنے کا اہتمام نہیں رہا۔ تو عند الضرورة عام طور پر فقہاء مجتہدین کے ھاں انفرادی اجتہاد کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور ہر مجتہد و فقیہ اجتہادی مسائل میں اپنی شخصی رائے سے فیصلہ کرنے لگا۔ اور اس کے معتقدین و متوسلین اس کے علم و تقوی اور اجتہادی اہلیت کی بناء پر اعتماد کرکے اس شرعی حکم کی پیروی کرتے اور مختلف مجتہدین کے مختلف مسالک یوں بنتے گئے۔ اور ہر مسلک کے ساتھ وابستہ لوگ ہوتے تھے۔ البتہ بعد کے اس دور میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اجتہادی مسائل میں وھی شورائی انداز ضرور رہا۔ اور حقیقت یہی ہے کہ یہی چیز حنفی فقہ کی ایک

خصوصیت اور امتیازی شان ہے۔ کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے غیر سرکاری طور پر اپنے تلامذہ و مسترشدین کے حلقہ میں اسی نوعیت کا شورائی نظام مسائل شرعیہ کی تحقیق کے لئے قائم کیا۔ جو حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ہاں معمول تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر جب کہ فقہ اسلامی کی تدوین جدید کے موضوع ہر کچھ لکھا جا رہا ہے اس تدوین کا بھی اجمالی تذکرہ ہو جائے۔ جو شورائی انداز میں امام ابو حنیفہؒ نے فقہ حنفی کی کر دی تھی۔ کیونکہ یہ طریقہ تدوین اور طریقۂ استنباط و استخراج مسائل اب ہمارے لئے ایک بہترین نمونہ بھی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ جب ۱۳۲ ھ میں انقلاب آیا۔ بنو امیہ کا دور حکومت ختم ہوا اور عباسیہ کی حکومت قائم ہوئی تو امام ابو حنیفہؒ حجاز مقدّس سے اپنے شہر کوفہ تشریف لے آئے یہاں آ کر انہوں نے شریعت اسلامیہ کو باقاعدہ ضابطۂ قانون کے قالب میں ڈھالنے کے لئے وضع قوانین کی ایک منظم مجلس شوری قائم کی۔ جس کے رأس یعنی صدر مجلس وہ خود تھے۔ چنانچہ آپ کے مشہور سوانح نگار مؤفق لکھتے ہیں۔

فوضع ابو حنیفۃ مذہبه شوریٰ بینهم لم لیتبد فیه بنفسه دونهم (موفق ج ۲ ص ۱۲۳)

پھر امام ابو حنیفہؒ نے اپنے مذہب کو شوری (باہمی مشورہ) پر مبنی کر دیا۔ مجلس شوری کے ارکان سے الگ ہو کر محض اپنی ذاتی اور انفرادی رائے کے ساتھ فقہ کی تدوین کو وابستہ نہیں کیا۔

اور اس مجلس شوری میں ہر فقہی مسئلہ کو زیر بحث لا کر طے کرنے اور آخری فیصلہ کرنے کا طریقہ یہ لکھا ہے۔

کان یلقی مسئلة مسئلةً یقلبهم و یسمع ما عندهم و یقول ما عنده و یناظرهم شهرا او اکثر من ذلک حتی لیستقر احد الاقوال فیها (ج ۲ ص ۱۳۳)

وہ اس مجلس میں ایک ایک مسئلہ پیش کرتے اور لوگوں کے خیالات و نظریات کو الٹ پلٹ کر معلوم کرتے - جو کچھ مجلس کے ارکان کے پاس معلومات ہوتے انہیں سنتے اور جو علم امام کا ہوتا اس کو بیان فرماتے اور مجلس والوں سے مناظرہ کرتے اور یہ مناظرہ کبھی ایک مسئلہ پر مہینہ مہینہ بھر یا اس سے بھی زیادہ زمانہ تک جاری رہتا - یہاں تک کہ اس مسئلے کا کوئی ایک پہلو متعین ہو جاتا اور مسئلہ طے ہو جاتا -

مشہور فقیہ و محدث حضرت عبد اللہ بن المبارک کے حوالہ سے موفق نے یہ نقل کیا ہے کہ ایک فقہی مسئلہ اس مجلس میں بحث کے لئے پیش ہوا تھا فخاضوا فیھا ثلثة ایام (ص ۵۴) تین دن تک ارکان مجلس اسی ایک مسئلہ میں غور و خوض کرتے رہے - مشہور محدث سلیمان اعمشؒ نے اس مجلس شوری اور اس کے خصوصی طریق کار اور تحقیقی انداز کا ذکر کرتے ہوئے اس کی بہت اچھی تصویر کشی کی ہے - فرمایا اذا وقعت لھم مسئلة یدیرونھا حتی یضیئوھا (بحوالہ مناقب کردریؒ ص ۳) یعنی جب اس مجلس کے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوتا - تو یہ ارکان مجلس باھم اس مسئلے کو گردش دیتے رہتے ہیں یعنی سب کے سب اس پر اپنی اپنی دلیلیں اور اپنی اپنی رائے دیتے رہتے ہیں اور یوں گردش دیتے ہوئے بالآخر اس کو خوب روشن اور واضح کر دیتے ہیں - یہ بھی دیکھنا چاھئیے کہ اس مجلس شوری میں کیسے کیسے مجتہد ، فقیہ النفس محدّث ، مفسر اور عربیت کے ماہر و تجربہ کار حضرات شامل بحث و تحقیق ہوا کرتے تھے - اس مجلس شوری کے اعضاء و ارکان کے بارے میں حضرت امام شافعیؒ کے استاد اور مشہور مجتہد و محدث امام وکیع بن الجرّاح لوگوں سے کہا کرتے تھے -

کیف یقدر ابو حنیفةؒ ان یخطیء و معه مثل ابی یوسف و زفر و محمد فی قیاسھم و مثل یحیی بن ابی زائدة و حفص بن غیاث و حبان و مندل ابنا علی فی حفظھم للحدیث و معرفتھم به والقاسم